سیاسیات

فہرست مضامین

سیاسیات 804

ڈاکٹروں کی ممکنہ ہڑتال...... ہڑتالی سیاست 808

سنگدل سیاست اور انسانیت 812

سیاست، جمہوریت اور معاشرتی مسائل 816

سیاست، میڈیا اور گفتگو وخطاب کا طریقہ 819

صوبے کے نام کی تبدیلی اور ہمارا طرز عمل 823

☆......☆......☆

ڈاکٹروں کی ممکنہ ہڑتال۔۔۔ہڑتالی سیاست

میں جب کسی مسلمان ملک میں کسی بہت ادنیٰ مسئلے کے حل کے لئے مختلف شعبوں سے وابستہ لوگوں کو ہڑتال پر جاتا دیکھتا اور سنتا ہوں تو یک گونا حیرانگی کے ساتھ ساتھ پریشان و مغموم بھی ہو جاتا ہوں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے صحیح اسلامی ادوار میں میں نے کہیں نہ پڑھا ہے اور نہ سنا ہے کہ کسی اسلامی معاشرے کے بعض افراد نے اپنے مسائل کے حل کے لئے یا اپنے بعض ''حقوق'' کے حصول کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا ہو جس سے بندگانِ خدا کو نقصان و ضرر پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہو سکتا ہو۔

اسلامی معاشرے میں حقوق و فرائض کا ایک اتنا مقدس سلسلہ رواں دواں ہوتا ہے جس میں ہڑتال قسم کی کسی چیز کا موقع ہی نہیں آتا۔کیونکہ وہاں ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ میں پہلے اپنا فرض دیانت داری اور خوش اسلوبی سے ادا کرلوں تا کہ اللہ کے ہاں جواب دہی سے بچ جاؤں۔اس طرح کی پرخلوص ادائیگئ فرض کے نتیجے میں معاشرہ اور اس کے افراد ایسے لوگوں کو سرآنکھوں پر بٹھا کر مالا مال کر دیتے ہیں۔معاشرے کی طرف سے اس قسم کی عزت و تکریم کے بدلے فرائض ادا کرنے والے اکثر اپنے جائز اور واجب حقوق سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں کیونکہ اسلامی معاشرے کی بنیاد ایک دوسرے کے لئے قربانی اور ایثار پر مبنی ہوتے ہیں۔ جبکہ ہڑتال کے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ کسی حاکم کے ظلم سے تنگ آکر کام چھوڑ دینا وغیرہ۔ہڑتال کسی بھی طبقہ کی طرف سے ہو، زندگی کے بہت سارے شعبے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔لیکن پھر بھی ان کا کوئی نہ کوئی متبادل تلاش کیا جا سکتا ہے اور ہڑتال سے ممکنہ نقصان کی تلافی ممکن ہوتی ہے لیکن ڈاکٹرز حضرات یعنی مسیحائے قوم وملت ہڑتال کریں تو اس کا نہ تو کوئی متبادل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے ہونے والے نقصانات کا آزالہ ہو سکتا ہے۔اس لئے کہ ڈاکٹروں کی ہڑتال کا تعلق براہ راست انسانی دکھوں اور جانوں سے ہوتا ہے۔

اس بات میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ ڈاکٹرز حضرات نے دن رات ایک کرکے محنت کی ہوتی ہے۔لہذا ان کی زندگی کی ضروریات کا بطریقۂ احسن پورا ہونا ضروری ہے لیکن ان حضرات کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پوری قوم نے میڈیکل کالجوں کے قیام اور اس پر اٹھنے والے اخراجات کی ادائیگی میں بالواسطہ یا براہ راست حصہ لیا ہوتا ہے۔لہٰذا قوم کے غریب غرباء کا ان پر ایک حق ہوتا ہے۔اس لئے میرے خیال میں یہ بات

ڈاکٹروں کے شایانِ شان نہیں کہ اپنے بہت کمتر (Pity) مطالبات منوانے کے لئے ہسپتال میں دور دراز سے آئے ہوئے مریضوں کے لئے نسخے لکھنا بند کر دیں۔

میرے خیال میں پاکستانی معاشرہ ضروری تیاریوں کی مراحل سے گزرے بغیر گلوبلائزیشن میں اس بری طرح پڑ گیا ہے کہ اب مادیّات کے بغیر اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب مسیحائے قوم اپنے چند ہزار روپیہ الاؤنس کے حصول کے لئے او پی ڈی سے ہڑتال پر جانے کے لئے حکومت وقت کو دھمکیاں وغیرہ دینے لگے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ہڑتال تو ظالم کے ظلم کے خلاف ہوتا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی حکومت ظلم کرنے پر آمادہ ہے اور نہ کوئی غیر ملکی آقا ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ڈاکٹرز حضرات اپنے جائز مطالبات کے حصول کے لئے احتجاج ضرور کریں لیکن اس انداز سے کہ ملک وقوم کا نقصان نہ ہونے پائے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اب ہڑتال وغیرہ قصۂ پارینہ ہوکر پر امن احتجاج کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ اس میں سیاہ پٹیاں باندھنا، واک، مذاکرات، بینرز آویزاں کرنا، یا زیادہ سے زیادہ رہنما قسم کے لوگوں کا علامتی ہڑتال کے لئے بیٹھنا شامل ہے۔ میرے خیال میں موجودہ زمانے میں مغربی ممالک کے ڈاکٹروں کا کسی نے کبھی ہڑتال پر جانا نہیں دیکھا سنا ہوگا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں ان کو حکومتیں جو مراعات دے رہی ہیں اس کی موجودگی میں ہڑتالوں وغیرہ پر جانا ناشکری ہی کہلائے گی۔ لیکن یہاں میں اپنے معزز ڈاکٹر حضرات سے عرض کرتا جاؤں کہ مسلمان معاشرے میں اللہ تعالیٰ پر ایمان وعقیدہ ایک ایسی نعمت ہے جس کا نعم البدل مغربی معاشروں میں متصور ہی نہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ ہمارے ڈاکٹروں کو وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو ہونی چاہئے لیکن اس کے ساتھ ہی اگر سنت طریقہ کے مطابق اپنے سے کم تر پڑوسی ملک کے حال پر نظر رکھیں جہاں کے ڈاکٹروں کو ہمارے ہاں کے ڈاکٹروں سے کم مراعات وسہولیات حاصل ہیں لیکن پھر بھی اپنا کام ایک مشن سمجھ کر کئے جا رہے ہیں۔ لہٰذا پورے حقوق نہ ملنے کی صورت میں اگر نیت خالص کر کے معاوضہ اور صلہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی کریم ذات سے بہت کچھ ملنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

معاشرے ایسے ہی بے لوث لوگوں کی قربانیوں کے طفیل پروان چڑھتے ہیں اور جمود کا شکار نہیں ہوتے۔ لوگوں کا علاج معالجہ کرنا صرف پیشہ نہیں بلکہ یہ ایک لحاظ سے پیغمبرانہ پیشہ ہے۔ پیغمبرانہ اس لحاظ سے کہ یہ

عبادت میں شامل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں قرآن کریم میں آیا ہے کہ وہ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ "ہمارا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے"۔

ڈاکٹر صاحبان! اللہ تعالیٰ کا خاص شکر ادا کریں کہ اتنے سارے لوگوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس اہم کام کے لئے منتخب فرمایا ہے کہ بیمار اور معذور لوگوں کی خدمت کر کے ان کا دل مٹھی میں لے سکتے ہیں اور معلوم نہیں کس دردمند مریض کے زخم اور درد پر پاہا رکھ کر کسی مقبول لمحے میں آپ کے حق میں اس کے منہ سے نکلتی ہوئی دعا بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا درجہ حاصل کر لے اور آپ کے ایسے مسائل حل ہو جائیں جو لاکھوں روپے خرچ کر کے بھی حل نہ ہو سکتے ہوں۔

اس کے برعکس ہڑتال کی صورت میں بہت سارے خطرات میں سے عین ممکن ہے کہ کوئی مریض آپ کی بروقت توجہ اور علاج نہ ملنے کے سبب اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اس کا زخم اور مرض بڑھ کر پیچیدہ صورت اختیار کر لے اور وہ آپ کے لئے عمر بھر کا ایسا روگ بن جائے جسے آپ کبھی بھول نہ سکیں۔

اس کے علاوہ آپ کی ہڑتال کی وجہ سے مریضوں کے لواحقین کی ذہنی اذیتوں کے ساتھ ساتھ غریب لوگوں کے لئے ایک دن رات کا خرچ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبان! کیا آپ کو معلوم ہے کہ صوبہ سرحد میں کتنی غربت ہے اور صوبہ کے کتنے دور دراز علاقوں سے لوگ کتنی مجبوریوں کے ساتھ اپنے مریضوں کے ساتھ خیبر ٹیچنگ ہسپتال آتے ہیں۔ آپ کے ہسپتال کے اسی فیصد مریض وہ لوگ ہیں جو بیماری کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد علاج کے لئے ہسپتال کا رخ کرتے ہیں۔ اگر یہاں ان کو ہڑتال سے واسطہ پڑ جائے تو ان کے دل پر جو گزرے گی آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں؟۔

ان حقائق، روایات، مجبوریوں، معذوریوں اور اللہ و رسول کا خوف اور دور دراز سے آئے سارے مریضوں کے آہ و بکا کو مدنظر رکھتے ہوئے میں آپ سے مملکتِ خداداد کے ایک بہت کمزور اور عاجز فرد کی حیثیت سے ہاتھ باندھ کر التماس کرتا ہوں کہ خدارا ہڑتال پر نہ جائیے اور اپنے مقدس پیشے اور مشن پر داغ اور دھبہ کبھی نہ لگائیے کہ صوبہ سرحد کے سب سے بڑے مؤقر ہسپتال کے بہترین ڈاکٹر اپنے تھوڑے سے مادی نفع کے لئے اپنے قومی و ملی مشن کو پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حکومت سے بھی اپیل کی جاتی ہے کہ اگر وسائل ساتھ دے رہے ہوں تو خرابیٔ بسیار کے بعد مطالبات کو ماننا یقیناً غفلت اور کوتاہی ہوگی۔ اگر

کہیں ڈاکٹروں کے مطالبات جائز نہیں یا حد سے بڑھے ہوئے ہیں تو ان کو مذاکرات کی میز پر لا کر دلیل اور منطق کی زبان میں قوم وملک کے بہترین مفاد سمجھا بجھا کر قائل کرنے کی کوشش ہونی چاہئے کیونکہ مملکتِ خدادا میں ہمارا نفع ونقصان اور غم اور خوشی ایک ہے اور ایک رہے گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر حال میں سیدھی راہ پر قائم رکھے۔ آمین۔

☆......☆......☆

سنگدل سیاست اور انسانیت

سیاست کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اور اس کا آج جو معنیٰ بھی رائج ہے، اس سے قطع نظر اس کا مصدر عربی زبان میں بہت اچھے معانی کا حامل ہے۔ اس لفظ کا مصدر سَاس یَسوُسُ، سَائِیس ؒ سے نکلا ہے جس کا معنٰی عام آدمی بھی جانتا ہے۔ ہاں وہی سائیس جو گھوڑوں کو سدھانے کا کام کرتا ہے۔ سائیس گھوڑوں کو صرف سدھانے کا کام ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی خوراک، صحت اور چال چلن پر گہری نظر رکھتا ہے۔

سیاست اور سیاستدان کا تعلق بھی انہی معنوں میں سائیس کے ساتھ بنا ہے کہ سیاست دان کا بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کے جذبات، ضروریات اور بنیادی حقوق کو محفوظ کرنے کے لئے مضبوط بنیادوں پر ضروری قانون سازی کر کے اقدامات کرتا رہے۔

لفظ سیاست کا شجرۂ نسب لاطینی زبان میں شاید پالیٹک سے بھی ملتا ہے اور اس کے معنی ہیں وہ کام جو حکمت پر مبنی ہو۔ اب عربی اور لاطینی اور انگریزی زبانوں میں لفظ ''سیاست'' بنی نوع انسان کی خدمت اور فلاح کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

لفظ سیاست کو اس کی صحیح تعبیر اور معانی انبیائے کرام علیہم السلام اور جناب رسولؐ نے عطا کیں۔ آپؐ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے سیاست کے معانی بر سرزمین عملی صورت میں لوگوں کو دکھلائے بھی اور سکھلائے بھی۔

اسی اعلیٰ سیاست کے تحت خلافت جو انسانیت کے لئے بہترین اور منتخب کردہ نظام الٰہی تھا۔ دنیا میں رائج ہو کر کائنات و مافیہا کی فلاح و بہبود کا ضامن بن کر ابھرا۔ خلافت راشدہ کے دوران اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر دنیا کے گوشے گوشے تک پھیلا۔ مخالفین ہزار پروپیگنڈا کرے اور غلط معلومات لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس زمانے میں اپنے بہترین تعلیمات، اخلاقیات واقدار کے زور پر باطل نظام ہائے زندگی کو پچھاڑ کر کے ہی آگے بڑھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں سیاست کے معانی انسانیت کی خدمت کے تھے۔ قوم کا رہنما، رئیس اور سردار قوم کا خادم ہوتا تھا۔ لیکن انسانیت کی بدقسمتی دیکھئے کہ خلفائے راشدین کی آنکھیں بند ہوتے ہی وہ نظامِ حکومت وسیاست دنیا میں رائج ہوئی جسے ملوکیت، شہنشاہیت،

آمریت، استبداد اور نہ جانے کیا کیا نام دیئے جاتے رہے۔ لیکن لب لباب ان سارے نظاموں کا یہی ٹھہرنا کہ حضرت انسان اس کے بنیادی حقوق سے محروم ہوا۔

شہنشاہیت اور بادشاہت کے ادوار میں انسان اور اقوام پر کیا گزری، یہ طول طویل داستانیں کتب تاریخ میں محفوظ ہوگئی ہیں لیکن حضرت علامہ اقبالؒ نے ایک ہی شعر میں سارا قصہ سنا دیا ہے۔

اسکندر و دارا کے ہاتھوں سے جہاں میں

سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک

حضرت انسان بڑا سخت جان ثابت ہوا ہے، بادشاہوں اور ان کے چیلوں کے ہاتھوں چرکے برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھا تو ترقی، آبادی اور فلاح کے نام پر مختلف ازموں کا شکار ہوا۔ ایک زمانے تک فیوڈل ازم اور پھر کیپٹل ازم کے درمیان گیند بنا رہا۔ ان دو ظالم شکاریوں کے درمیان انسان لہولہان تھا کہ اچانک ایک اور ازم [سوشلزم] نجات دہندہ بن کر سامنے آیا۔ اس کے بعد تو کیپٹل ازم اور سوشل ازم کے درمیان حضرت انسان کی فلاح و بہبود کے نام پر وہ کھیل کھیلے گئے کہ انسانیت شرم کے مارے ٹھٹھر کر دم توڑ گئی۔ اس کھیل کے نتیجے میں اگرچہ ستر [۷۰] اسی [۸۰] برس کے بعد سوشلزم تو جہنم واصل ہوگئی لیکن کیپٹل ازم کو وہ پر پرزے مل گئے جس کے بل پر وہ ساری دنیا کو بلاشرکت غیرے اپنی جاگیر سمجھنے لگی اور اب وہ خود اس جاگیر کے بگڑے چودھری اور نواب کی طرح وہ کچھ کر رہا ہے جس سے ایک دنیا الحفیظ والآمان کا ورد و وظیفہ کر رہی ہے۔

کیپٹل ازم نے دنیا کو ترقی کے نام پر تین تحفے دیئے ہیں، جمہوریت، لادینیت اور آزاد معیشت۔ ان تینوں کا مقصد انسان کی فلاح و آزادی بتایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ سرمایہ داری اور جمہوریت کے علمبردار یہ ممالک دوسری قوموں کو امریت سے آزادی اور جمہوریت دینے کے نعرے پر ان کو غلام بنانے کے لئے طاقت کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔ اس نظام کے تحت چند افراد یعنی پارٹی کے بڑے عوام کو جمہوریت تمام بیماریوں کا علاج اور آزادی کی نیلم پری بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے ہاں جمہوریت کی روح مفقود ہوتی ہے لہذا جمہوریت کے نام پر دنیا میں ایک ظالمانہ سامراجیت کو جنم دیا گیا ہے۔ کیپٹل ازم کے تحت سرمایہ دار جمہوریت اور آزاد معیشت کے نعرے کے تحت حقیقی طور پر ترقی یافتہ ہونے کی بناء پر اپنی کثیر پیداوار کی کھپت کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش میں دنیا کا کونا کونا چھان رہے ہیں۔ غریب

ممالک میں اپنے مال کی کھپت کے علاوہ وہاں سے سستے داموں وافر مقدار میں اپنی صنعتوں کے لئے خام مال بھی لوٹ کے بھاؤ حاصل کرتے ہیں جس کی بناء پر ان کا وہ اصل سامراجی چہرہ اس وقت کسی بھی ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی اسی لت نے انسان کو اس حرصِ زر میں مبتلا کر دیا ہے جسے لعنت کے علاوہ کوئی کام نہیں دیا جا سکتا۔ ذاتی ملکیت کو بڑھانے اور راتوں رات امیر ہونے کی دھن نے سرمایہ دار دنیا کو منفی ہتھکنڈوں پر آمادہ کر لیا ہے۔ یہ سرمایہ دار اپنے کارخانوں کی پیداوار کو گھٹانے بڑھانے اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعے اشیاء کی قیمتوں پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ حکومتوں اور ان کے اہلکاروں کو بھی قابو میں رکھتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملکوں میں تو حکومتی عہدیداروں کو اپنے منافع وغیرہ میں بھی شامل کر لیتے ہیں۔

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے اپنی امارت کی بل بوتے پر ساری دنیا کو اپنے چُنگل میں پھانس لیا اشتراکیت کے بانی اور سرمایہ دارانہ نظام کے سخت ترین مخالف لینن نے اپنی کتاب (Imperialism- The highest stage of capitalism) میں اسی بات کو واضح کیا ہے۔

سرمایہ داری نظام کی انہی خرابیوں کے ردعمل میں [سوشلسٹ] نظام ابھرا تھا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگرچہ اس نظام نے اپنے ہاں سرمایہ داری کی جڑ تو کاٹ دی لیکن دولت کی منصفانہ تقسیم کو ممکن نہ بنایا جا سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غیر فطری طریقہ سے اس کو ممکن بنانا ناممکن تھا۔ لوگوں کو روٹی کپڑا، مکان اور تعلیم وصحت کی سہولتیں میسر آئیں جو بہت بڑی بات تھی لیکن عدل اجتماعی (Social Justice) جیسی حقیقی انسانی ضرورت مفقود رہی جس سے انسان کا ضمیر مطمئن نہ ہو سکا۔ نجی ملکیت اور مذہب سے انسان کو بیگانہ کر کے کبھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام نے انسان کو نہ صرف داخلی بلکہ خارجی کشمکش میں بھی مبتلا کر دیا۔

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظاموں کی کشمکش نے انسانیت کو بہت متاثر کیا۔ دو جنگیں ہوئیں، جس نے کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد بہت باتیں ہوئیں لیکن صرف باتیں ہی باتیں رہیں۔ آج بھی حضرت انسان جمہوریت اور سرمایہ داری کے ہاتھوں لٹ رہا ہے اور اپنے بنیادی حقوق سے محروم پھر رہا ہے۔ بوسنیا، عراق، افغانستان، کشمیر، چیچنیا اور دنیا کے اور بہت سارے خطے سرمایہ داری کے اسی بھٹی میں خاکستر ہو رہے ہیں۔

امریکہ میں چوبیس ہزار قبروں پر کل پھولوں کے ہار چڑھائے جا رہے تھے۔ عراق اور افغانستان کی جنگوں میں کام آئے ان لوگوں کی جوان بیویوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں رواں تھیں۔ ماؤں کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ کوئی تصور کر سکتا ہے کہ جب حفاظتی آلات سے لیس ہتھیار بند امریکی فوجوں ہزاروں کی تعداد میں رزق خاک ہو گئے ہیں تو عراق اور افغانستان کے کتنے بے بس لوگ پیوند خاک ہوئے ہوں گے اور ان کے اہل و عیال پر کیا گزری ہوگی۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ دنیا کو اس مصیبت سے نکالنے لئے اپنے عمل و کردار کے ذریعے اس نظام کی طرف متوجہ کریں جس میں ستائیس غزوات کے دوران صرف ۱۰۱۸ آدمی کام آئے تھے۔ کیا اس سیاست کے تحت قائم حکومتیں شروع سے انسان کی تباہی و ہلاکت کا باعث نہیں ہیں۔ کیا ایسی سیاست سنگدل نہیں ہے جس نے انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا ہے، کیا اس نظام اور سیاست کی ضرورت نہیں ہے جو لوگوں کو انسانیت کی لڑی میں پروے اور ان کو بھائی بھائی بنا دے۔

☆......☆......☆

سیاست، جمہوریت اور معاشرتی مسائل

میں سیاسی موضوعات پر لکھتا اور بولتا کم لیکن سوچتا زیادہ ہوں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں کہ اگر آپ ملک وقوم اور سیاست وجمہوریت وغیرہ کے حوالے سے کسی پر اصلاحی نقطۂ نظر سے بھی تنقید کرنا چاہیں گے تو اس کے ردِ عمل میں آپ پر کئی قسم کی بلائیں نازل ہوسکتی ہیں۔ میں پاکستان میں دہشت گردی، مہنگائی اور ضروریاتِ زندگی کے فقدان اور عدم دستیابی کی مہیب بلاؤں کی موجودگی میں کسی اور بلا کو ''آ بیل مجھے مار'' کے مصداق خواہ مخواہ دعوت دینے کا قائل نہیں۔

سیاست پر بات نہ کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ لفظ سیاست پاکستان میں اتنا عام، زود استعمال بلکہ غلط العام زیرِ استعمال ہے کہ ہمارے دیہاتوں اور شہروں میں زندگی کے سارے طبقات کے لوگ مختلف مواقع پر اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے بہت ساری عجیب باتوں کے علاوہ یہ بات عام طور پر لکھی اور کہی جاتی ہے کہ فلاں نے میرے ساتھ ''سیاست'' کی۔ ''میرے ساتھ سیاست مت کرو''، ''تم بڑے سیاستدان بنے پھرتے ہو''۔ ہمارے ہاں سیاست ہماری نس نس میں رچ بس گئی ہے اس لئے ہر آدمی دوسرے سے شاکی ہے کہ وہ میرے ساتھ سیاست کر رہا ہے۔ اس قسم کی سیاست کے اداروں، افراد اور معاشرے پر بہت ناخوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی سیاست کے شاخسانے ذرا ملاحظہ کیجئے کہ وطنِ عزیز میں سرکاری ملازمین جو صرف سرکار کے ملازم اور خادم ہونے چاہئیں، مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ وفاداری کا دم بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بات یہاں پر رکتی کہ چلو، نظریہ اور فکر رکھنا ہر انسان کے بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ لہٰذا کسی شخص کا وطنِ عزیز یا بیرونی دنیا کے کسی جماعت، یا سیاسی شخصیت کے نظریات سے فکری ونظری لحاظ سے متاثر ہونا بھی جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کہاں کی سیاست ہے کہ ہر سیاسی پارٹی اقتدار میں آنے کے بعد ملک اور صوبوں میں سارے کلیدی عہدوں پر ''اپنے لوگوں'' کو لایا جائے تاکہ کام کرنے میں آسانی ہو۔ اس عمل کی وجہ سے ہر ڈھائی تین سال بعد ملک کی بیوروکریسی اور اعلیٰ آفیشلز میں جو کھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے، اس کے ہمارے دفاتر کے انفراسٹرکچر پر بہت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سیاست کی وجہ سے ہمارے ملکی دفاتر میں اعلیٰ مناصب پر فائز عہدار سیاسی رجحانات کی وجہ سے بعض اوقات حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا

سبب بھی بنتے ہیں۔ یہ صورت حال دونوں حوالوں سے ملک وقوم کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہوسکتی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے سارے ملازمین کو جہاں اس بات کا پابند کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کسی طرح بھی ''سیاست'' کی وجہ سے ملکی مفادات کو خطرات سے دوچار کرنے کے عمل سے ہر صورت میں دور رہیں وہاں ملازمین کو حکومتی سطح پر قانون سازی کر کے اس بات کی یقین دہانی کرانا ضروری ہے کہ اگر کوئی ملازم اپنی بنیادی ڈیوٹی اپنی بھرپور صلاحیتوں کے مطابق سرانجام دینے میں کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوتا، تو محض سیاسی نظریات کی بناء پر اس کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے ہاں لفظ سیاست کی بدنامی میں بہت سارے عناصر کا عمل دخل ہوسکتا ہے لیکن اس میں بنیادی کردار سیاستدان شعوری یا لاشعوری طور پر خود ہی ادا کرتے ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ کیا سیاست اور جمہوریت کی رو سے جائز ہے کہ ہمارا ایم این اے اور ایم پی اے جس حلقہ سے منتخب ہو کر وزیر یا کوئی اور یا منصب وغیرہ پاتا ہے تو وہ عموماً اپنے ہی حلقہ کے لوگوں کو ''اپنوں'' اور ''غیروں'' کی گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ لہٰذا ''اپنوں'' کے لئے گلی کوچے پختہ کرنا اور ملازمتوں میں ان کا خیال رکھنا، ٹیوب ویلز وغیرہ دینا، تو جاری رہتا ہے لیکن اسی حلقہ کے ''غیروں'' میں شمار لوگ اپنے بنیادی دستیاب حقوق سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ جمہورت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انتخاب کے بعد انتخابی پسند و ناپسند کو یکسر بھول کر سارے ابنائے وطن کو ایک حلقہ سمجھ کر جمہوریت کے ثمرات سے مستفید کرایا جائے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وطنِ عزیز میں باسٹھ برس گزرنے کے بعد بھی جمہوریت جڑ نہیں پکڑ سکی۔

اس بات میں شک نہیں کہ پاکستان کی آب وہوا مختلف وجوہات کی بناء پر جمہوریت کے لئے ابھی تک سازگار نہیں ہوسکی، لیکن اب کم از کم اتنی بات تو پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے کہ وطن عزیز میں جمہورت کے کماحقہ پروان نہ چڑھنے میں سیاستدانانِ وطن کا بھی اچھا بھلا حصہ ہے۔

آج ان سطور میں وطنِ عزیز میں جمہوریت کو استحکام نہ ملنے میں سیاستدانوں کا جو کردار رہا ہے اس میں مارشل لاؤں کو کندھا دینے، ہارس ٹریڈنگ کا شکار ہونے اور دیگر بہت سارے معاملات کی تفصیل بیان کرنا نکلے ہوئے سانپ کی لکیر پیٹنے کے مترادف ہوسکتا ہے لیکن یہ تو ابھی کل کی بات ہے کہ سیاستدان جمہوریت جمہوریت کرتے ہوئے آپے جمہوریت نہیں ہونا چاہتے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارھویں ترمیم کے ذریعے دستور

پاکستان سے اس شق (Clasue) کو بھی اڑا دیا گیا ہے جس کی رو سے سیاسی جماعتوں کے اندر بھی جمہوری روح کی بحالی کے لئے ایک نہایت مناسب ٹرم اور مدت کے بعد پارٹی انتخابات کرانا ضروری ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح پہلے پاکستان میں موروثی سیاست کا دور دورہ تھا۔اب یہ اور بھی مضبوط بلکہ ایک لحاظ سے قانونی ہو جائے گا کہ اب دستور کی رو سے ان پر کوئی ایسی پابندی نہیں ہے۔

ہم پاکستانی عوام ویسے اس لحاظ سے بھی کتنے غریب، بدقسمت اور قابلِ رحم ہیں کہ جو رہنما ہم سے جمہوریت کے نام پر جمہوریت کے لئے ووٹ مانگتے ہیں وہ صحیح معنوں میں اس نظام یا اس کی روح پر ایمان نہیں رکھتے۔ ورنہ کسی بھی بہترین اجتماعی نظام کی کامیابی تب ممکن ہوئی ہے جب اس نظام کے دعویدار، رکھوالے اور محافظ خود سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔تب عام لوگ بھی دل وجان سے اس نظام پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کے لئے وقت پڑنے پر دل وجان پیش کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

جمہوری نظام کی بقاء اور نشو ونما کے لئے لوگوں کو اپنا مائنڈ سیٹ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔جمہوریت کا مطلب ہے اپنی بات کو دلائل، منطق اور اخلاقیات کے ذریعے دوسروں سے منوانا، اگر دوسروں کی دلیل، منطق اور اخلاقیات زیادہ مضبوط اور راست ہوں تو پھر قائل ہونا پڑے گا۔

پاکستان میں جمہوریت کا نام تو بہت لیا جاتا ہے لیکن آج تک اس کی روح پر عمل بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔جمہورت کا ادنی ترین تقاضا یہ ہے کہ سنو اور سناؤ، مانو، اور مناؤ، لو اور دو، معافی لو اور معافی دو کی بنیادوں پر ملک وقوم کے لئے کام کریں۔جمہوریت کا مفہوم عوام کی خدمت ہے۔خدمت کے بدلے میں دولت نہیں خدا ملتا ہے۔جس کو خدا مل جائے اس سے سب کچھ مل جاتا ہے۔دنیا وآخرت سنور جاتی ہیں۔کیا ہم کبھی سچے جمہوری اصولوں[شوریٰ] اور اسلام کی روح کے مطابق سیاست کرنے کے بارے میں سوچیں گے۔

☆......☆......☆

سیاست، میڈیا اور گفتگو وخطاب کا طریقہ

معلوم نہیں سیاست کے حوالے سے یہ جملہ کس بے دل کی زبان پر جاری ہوا تھا کہ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی معاشرے کے اخلاق واقدار کی رو سے یہ جملہ ہی غلط ہے۔ اسلام میں دل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ دل ہی مہبط وحی وایمان ہے۔ ایمان، نہ نور، وحی، حکمت ودانش کا تعلق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو دل [حکمت] سے نوازا ہے جس کے ذریعے وہ اسی طرح زندگی گزارتا ہے جس طرح اس کو حکم دیا گیا ہے۔ صرف انسان وہ مخلوق ہے جسے ساری مخلوقات میں سے توانا، حساس اور مضبوط دل دیا گیا ہے۔ اور اسی دل کے ذریعے وہ ضمیر واحساس کی قوت رکھتا ہے۔ یہی ضمیر ہوتا ہے جو انسان کو زندگی کے معاملات میں حق وباطل، جائز وناجائز وغیرہ کے درمیان فرق سکھاتا ہے۔

انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے دل کے احساسات وجذبات کو لوگوں کے سامنے لانے کے لئے زبان جیسی نعمت سے نوازا ہے۔ جن کی قدردانی یا شکرگزاری کے بارے میں بھی ہم انسان دیگر بہت ساری نعمتوں کی ناشکری کی طرح ناشکرگزار ہی واقع ہوتے ہیں۔ کیونکہ زبان سے نکلنے والا ہر کلمہ اپنے مثبت یا منفی اثرات اور وزن رکھتا ہے۔ اور نتیجہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے زبان کی اہمیت واثرات کے پیش نظر فرمایا:

''جو شخص مجھے اس چیز کی ضمانت دے جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان [زبان] ہے اور اس چیز کی ضمانت دے جو اس کی دو ٹانگوں کے درمیان [شرمگاہ] تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت ہوں''۔

انسانی اعضاء میں دل وزبان کی اہمیت کے پیش نظر یہ بات کتنی اہم ہے کہ ''انسان کا نصف حصہ زبان ہے اور دوسرا نصف حصہ دل [شعور، ضمیر، احساس] ہے۔ ان دو اہم چیزوں کے بعد تو گوشت پوست اور خون وہڈی باقی رہ جاتی ہے۔

پھر ذرا اس بات پر غور کریں کہ اگر ہماری سیاست جن کے سینے سے دل پہلے ہی غائب ہے، زبان کا بھی وہی حال ہو جائے جو آج کل رائج ہے، تو ہمارا معاشرہ جو پہلے ہی بہت سارے مسائل کا شکار ہے، اللہ نہ کرے کہ مزید کتنی مصیبتوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

آج کے زمانے میں سائنسی ایجادات وترقیات کی بدولت کبھی کبھی یہ دعویٰ بھی سامنے آتا رہتا ہے کہ آج

کا انسان بھی بہت ترقی یافتہ ہوگیا ہے۔ مجھے بعض حوالوں سے یہ بات ماننے میں تھوڑا سا تردد ہوتا ہے۔ کیونکہ تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ پرانے زمانے کے بادشاہ اپنے مخالفین کو صفائی اور دلائل وشواہد پیش کرنے کا موقع دیئے بغیر ان کے سروں کی قیمت کا علان کر دیتے تھے اور اس کے ساتھ ہی موقع ملتے ہی ان کے سروں کے مینار بھی بنا دیتے تھے۔ انسانوں کی قتل و غارت تاریخ میں تب ہوئی ہے جب دلیل و منطق کی زبان کو موقع نہیں دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں زبان، دلیل و منطق اور دل وضمیر کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اسی بناء پر تاریخ میں سب سے کم انسان اسلامی جنگوں میں کام آئے ہیں جبکہ غیر اسلامی دنیا کی طرف سے دنیا پر مسلط کردہ جنگوں میں سب سے زیادہ لوگ ہلاکت و بربادی کی بھینٹ چڑھے ہیں۔

بات وحالات بگاڑنے میں زبان کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ ہم مسلمان اگر تہیہ کرلیں کہ بات کرتے وقت اس لوتھڑا گوشت کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں گے تو ہمارے معاشرے میں دلیل و منطق کے جواب میں اس قسم کی آوازیں سننے کو نہیں ملے گی کہ ہم فلاں فلاں کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔ ہاتھ پاؤں توڑ دیں گے۔ اور ایک چیز جس نے ہماری سیاست کے سینے سے واقعی دل نکال دیا ہے یہ ہے کہ ہم خود پر کسی کی تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ حالانکہ معاشروں میں اختلاف رائے کے اصول ہی یہی ہوتے ہیں کہ دوسرے کی مکمل بات سنی جائے۔ اگر اس کی بات کے جواب میں عقل ودلیل پیش کی جائے تو غیر جانبدار لوگ یا عام لوگ ہمیشہ حق ہی کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔

اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے اور دوسروں کو اپنی رائے کا قائل کرنے کے لئے زبان کا صحیح استعمال سیکھنا بہت ضروری ہے۔ زبان رابطہ اور ایک دوسرے کو متاثر کرنے کا ایک بڑا اہم وسیلہ ہے۔ اس کا صحیح استعمال اور اس کے ذریعے گفتگو کا انداز بولنے والے کی صفات میں سے ایک اہم ترین صفت میں شمار ہوتا ہے۔

شیخ سعدیؒ نے قرآن وحدیث میں میٹھی وشیریں ومدلل وسدید زبان کے استعمال کے اثرات جانکر کتنی خوبصورت بات لکھی۔ ے

بشیریں زبانی ولطف وخوشی

توانی کے پیلے بموئے کشی

''زبان کی مٹھاس اور لطف وخوشی سے ہاتھی کو بال سے کھینچا جا سکتا ہے۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کوگفتگو کے آداب کی بڑی تفصیل اور وضاحت سے ہدایت کی ہے۔زبان، اللہ تعالیٰ کی بہت ساری دلچسپ وعجیب قدرتوں، علامتوں اور معجزوں میں سے ایک ہے۔

دنیا میں مختلف زبانیں ہیں، پھرایک ہی زبان بولنے والے علاقوں میں شہر شہر اور بستی بستی کی بولیوں میں اختلاف وتنوع ہے اور مزید یہ کہ ہر شخص کا لہجہ تلفظ اور طرز گفتگو دوسرے سے مختلف ہے۔ان تمام زبانوں کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی اوران سب کووہ جانتا ہے۔نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

یقیناً اللہ تعالیٰ تمام زبانوں کو جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زبان کے صحیح صحیح استعمال کے بارے میں ارشاد فرمایا: وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا" [اور لوگوں سے اچھی طرح بات کرو]۔

ہم اگر ان سادی سی تعلیمات کو یاد رکھیں جن کے زیر کرنے اور استعمال کرنے میں محنت ومشقت پڑتی ہے اور نہ پیسے خرچ ہوتے ہیں لیکن انسانی زندگی اور معاشرے پر اس کے اثرات بڑے خوشگوار ہوتے ہیں اور آج بعض پیچیدہ مسائل حل کرنے میں اچھی گفتگو سے بہت زیادہ مدد لی جاسکتی ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ سچا اور پاکیزہ بول دنیا میں پھلتا پھولتا ہے۔اس کے اثرات دوررس ہوتے ہیں اوراس بولی کے بولنے والے لئے صدقہ جاریہ اور دونوں جہانوں کا توشہ بن جاتے ہیں۔اس کے برخلاف برے اور نازیبا بول اپنی برائی کی وجہ سے ظاہر ہوجاتے ہیں۔بولنے والے کی بدنامی اور برائے کا ذریعہ بنتے ہیں اور دنیا وآخرت میں اس کی تباہی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

ہم میں سے بہت سارے لوگ اپنی زبان کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔اس کی نگرانی نہیں کرتے تو یہ اپنے اثرات ضرور دکھاتی ہے۔اس کا اندازہ اس حدیث مبارکہ سے ہوتا ہے۔

بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا کوئی کلمہ کہتا ہے اور اس کی خاص توجہ نہیں دیتا۔لیکن اس کی وجہ سے اس کے درجات بلند کرائے جاتے ہیں۔اور بندہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کوئی بول بولتا ہے جس کی طرف وہ خاص توجہ نہیں دیتا لیکن اس کی وجہ سے وہ دوزخ میں جا گرتا ہے۔

زبان کے کردار پر اگر گہرائی سے غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آئیگی کہ اکثر عبادتیں، نیکیاں بھلائی کی باتیں اور اکثر حقوق العباد اس زبان کے ذریعے ادا ہوتے ہیں۔مبالغہ نہیں ہوگا اگر یہ کہہ دیا جائے کہ پچھتر فیصد

نیکیاں زبان سے ادا ہوتی ہیں اور اتنے ہی فیصد برائیاں زبان کے ذریعے ہوتی ہیں۔ جیسے، کلمہ طیبہ، کلمہ شہادت، نماز، ذکر، دعا، استغفار، حج کے احکام اور دعائیں، سلام کا تبادلہ، سچ بولنا، حق بات کہنا، وعظ ونصیحت، تلاوت قرآن مجید، اقامت واذان کہنا۔ نماز پڑھنا پڑھانا، علم پڑھنا پڑھانا، شک کرنا، لوگوں میں صلح کرانا، بیماروں کی عیادت کرنا اور بہت سارے اخلاق وآداب زبان کے وسیلے سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت ساری برائیوں کا تعلق بھی زبان سے ہے، جیسے کفر کے بول، جھوٹ کی گواہی، گالیاں، لعنت کرنا، چغلی، گندے مذاق اور ٹھٹھے، کسی کی بے عزتی کرنا، خوشامد، فحش گوئی، گناہ کے کاموں کے مشورے، بے ہودہ راگ طعنہ زنی، عیب جوئی، اور کتنے ہی برے اخلاق اور بے حیائی کے کام جن کا بڑا حصہ زبان سے ادا کرتی ہے۔ گویا انسان کی تعمیر میں زبان کا کردار بہت اہم ہے۔ لہٰذا انسانی معاشروں کی اصلاح وتربیت میں اس کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔

مباحثہ ومکالمہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گفت وشنید کے ذریعے فریق مخالف کی اصلاح کی جائے اس کو اپنے موقف پر قائل کیا جائے۔ اگر فریق مخالف کی دلیل قوی اور مضبوط ہو تو اس کو بھی تسلیم کرلیا جائے۔ قرآن کریم ہمیں اس سلسلے میں بہترین سبق اور ہدایت فراہم کرتا ہے کہ طاقت کا بے جا استعمال مسئلے کا حق نہیں ہوتا اور اللہ تعالی خالق کائنات جبار وقہار عزیز ذوانتقام سے بلند وبرتر اور طاقت ورو قوی کوئی بھی نہیں ہوسکتا لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ جب اللہ نے ابلیس کو سجدے کا حکم دیا تو اگر اللہ چاہتا تو اسے اسی وقت سزا دے دیتا اور ابلیس ایک لمحے کے لئے حرکت نہ کرسکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے خود طاقت استعمال نہیں کی بلکہ اس کو اظہار خیال کی آزادی دی سوال وجواب ہوئے، گفتگو میں دلائل دیئے گئے۔ ابلیس نے بھی مکالمہ کے دوران اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بزرگی کا پاس کیا حالانکہ وہ نافرمان یعنی دشمن تھا۔ اور خدا کی دھتکاری ہوئی بدترین مخلوق بن چکا تھا۔ اس کے باوجود مکالمے کے ذریعے دلائل مکمل ہوئے۔ اس پورے مکالمے کو قرآن کریم میں ذکر کرنے اور قیامت تک اس کو پڑھنے میں یہ سبق پنہاں ہے کہ فریقین میں جس قدر بھی اختلاف ہو اور جو بھی اختلاف کی نوعیت ہو۔ مدلل، مہذب اور شریفانہ مکالمہ ہی مسائل کے حل کا بہترین ذریعہ ہے۔

☆......☆......☆

صوبے کے نام کی تبدیلی اور ہمارا طرزِ عمل

صوبہ سرحد کا خیبر پختونخواہ بننے کی بارے میں گذشتہ ہفتہ ڈیڑھ سے قومی اخبارات و جرائد میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔صوبے کے نام کی تبدیلی کے مابعد اثرات کے حوالے سے ہزارہ میں جو کچھ ہوا، جیسے ہوا، جو جو عناصر اس میں کسی نہ کسی طرح شامل رہے، کسی بھی لحاظ سے پسندیدہ نہیں کہلایا جاسکتا۔

باسٹھ برس گزرنے کے بعد اور اکیسویں صدی میں بھی پاکستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی آج تک یہ تبدیلی بہت کم دیکھنے میں آئی کہ من حیث القوم یا جماعت یعنی اجتماعی طور پر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے ایک ایسا کردار ادا کریں جو ملک وقوم کے لئے ایک مثبت، تعمیری اور دوررس اثرات کا حامل ہو۔

قومی اسمبلی میں صوبے کی نام کی تبدیلی کے حوالے سے آئین میں اٹھارویں ترمیم سے بہت پہلے صوبہ سرحد کی اسمبلی نے تبدیلیٔ نام کے حق میں جب قرارداد منظور کی تو ان لوگوں کو جو صوبے کے نام کی تبدیلی کے بارے میں تحفظات رکھتے تھے، ان کو چاہیئے تھا کہ اپنی آواز مناسب انداز میں مناسب اور قانونی فورمز پر بلند کرتے اور حکومت وقت پر اثر انداز ہوکر اتفاق رائے پیدا کرنے کے مواقع حاصل کر لینے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب ان مواقع پر ان لوگوں نے کوئی مؤثر آواز نہ اٹھائی اور چونکہ اٹھارویں ترمیم میں سرحد کے نام کی تبدیلی بھی شامل تھی، لہٰذا ہزارہ کے لوگوں کو چاہیئے تھا کہ اپنے منتخب نمائندوں کو جمہوری انداز میں اپنا موقف پہنچاتے کہ وہ اسمبلی میں اپنے حلقوں کے عوام کی نمائندگی کا حق ادا کریں لیکن جب ان سارے مراحل پر ان قوتوں کی طرف سے کوئی ایسی مؤثر اواز نہ آئی اور اٹھارہویں ترمیم کا قومی اسمبلی سے پاس ہوا تو پھر بھی ہزارہ کے بھائیوں کے پاس ایک موقع تھا کہ ایک دفعہ پھر اپنے نمائندوں کو بیدار کر کے سینٹ میں اپنی آواز بلند کروانے کی کوشش کرتے۔لیکن جب ان سارے قانونی اداروں اور ذرائع سے گزر کر صوبے کا نام تبدیل ہوا تو صوبے کے سارے لوگوں کو قانون اور اسمبلی کے احترام اور ملک وقوم کی محبت میں لوگوں کو اسے اتحادِ قوم کی غرض بھی قبول کرنا چاہیئے تھا۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہزارہ کے بھائیوں نے خیبر پختونخواہ کو ایک جذباتی مسئلہ بنا کر جذبات کی رو میں ایسے بہہ گئے کہ آٹھ قیمتی جانوں کے ضیاع کے علاوہ بیسیوں لوگ شدید زخمی ہوکر صوبے

کے عوام کے درمیان تلخی اور انتشار پھیلانے کا باعث بنے۔ یہ بات قابل افسوس ہونے کے ساتھ ساتھ قابل مذمت بھی ہے کہ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اپنے جماعتی مفادات کے لئے ملکی مفادات کا خیال نہیں رکھتے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں بہت کم عوام کے مفادات کا خیال رکھتی ہیں۔ لیکن کم از کم اتنا خیال تو رکھنا چاہیئے کہ ان کی سیاست کی وجہ سے قیمتی جانوں کے ضیاع کے سبب کتنے خاندان اور افراد متاثر ہوتے ہیں۔

ہزارہ کے لوگوں کو عام طور پر پُرامن اور پاکستان پرست سمجھا جاتا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صوبہ کے نام کی تبدیلی کے سلسلے میں انہوں نے جو رویہ اختیار کیا اس میں منطق اور شعور کی بجائے جذبات اور بعض حوالوں سے نسلی اور جغرافیائی تعصب بھی شامل ہوگیا۔ اگرچہ اس بات کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ خیبر پختونخواہ کی حکومت پر ان کے مقابلہ میں اس حوالے سے حالات کو سنبھالنے کی زیادہ ذمہ داری پڑتی تھی کہ آخر وہ برسر اقتدار ہونے کی بناء پر عوام کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن یہاں پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جمہوری حکومتوں میں اپنی آراء کی اظہار کے لئے لوگوں کا جلسے جلوس کرنا ان کا بنیادی حق تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کو اگر جذبات کے انخلاء کا موقع دیا جاتا تو شاید یہ ناگفتہ بہ صورتحال واقع نہ ہوتی۔

اب جبکہ سینٹ میں اٹھارھویں ترمیم مکمل اتفاق رائے سے منظور ہوچکی ہے تو اس حوالے سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ صوبہ سرحد کے نئے نام کے حوالے سے نازیبا رویہ اختیار کرے۔ ہاں اگر کسی کو اس نام کے ساتھ اختلاف ہے تو قانونی اور آئینی چارہ جوئی کا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ آئین میں دوبارہ کہیں دو تہائی اکثریت کے ذریعے انیسویں ترمیم کے ذریعے کوئی اور نام لایا جاسکے لیکن اسمبلیوں کی ذریعے اس قسم کے فیصلے لینے کے لئے برسوں سیاسی جدوجہد کے علاوہ صبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ صوبہ کے حکومتی عہدیداروں نے ببانگ دہل کہا ہے کہ اس کے لئے ہم نے باسٹھ برس تک صبر و جدوجہد سے کام لیا۔ لہٰذا حکومت کے ساتھ صوبے کے سارے لوگوں کو صوبے کا نیا نام مبارک ہو، لیکن اس عرض کے ساتھ کہ خدارا، زندگی میں کسی بھی موقع پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے حد سے نہیں گزرنا چاہیئے۔

ہوائی فائرنگ نہ صرف قانوناً منع ہے، بلکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے اسراف اور اس کے ذریعے کسی بے گناہ اور معصوم جانوں کے جانے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا خیال بھی رکھنا ضروری ہے کہ ہزارہ کے جن گھروں میں ماتم ہے، ان کو کسی طرح بھی خوشی منانے کا یہ انداز نہیں بھاسکتا۔ لہٰذا سردست ہماری کوشش ہونی

چاہیئے کہ بے جا خوشیاں منانے کی بجائے ہزارہ کے بھائیوں کو گلے لگانے کا اب کوئی سبیل نکالیں۔

ہزارہ کے بھائیوں کو اب اس وقت تک صبر کرنا ہوگا جب تک ان کو آئینی جدوجہد کے ذریعے اپنا مؤقف منوانے کا موقع نہیں ملتا۔

اس وقت جبکہ یہ صوبہ خیبر پختونخواہ ہم سب کا صوبہ ہے۔ لہٰذہم سب کا فرض ہے کہ نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصّبات سے بالاتر ہوکر مسلمان بھائیوں کی طرح اخوت اور محبت کے ساتھ رہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پاکستان کے موجودہ صوبوں میں مزید صوبے بننے چاہئیں یا نہیں تو عوام کے منتخب نمائندوں کی وساطت سے یہ اسمبلیوں کا کام ہے۔ اگر پاکستان کی مضبوطی اور عوام کی خوشحالی کے لئے مزید صوبوں کی ضرورت ضروری سمجھی جاتی ہے تو وہ بھی اتفاق رائے اور افہام وتفہیم کے اور سوچ وبچار کے ساتھ قبل اس کے بنانا چاہیئے کہ لوگ سڑکوں پر آکر قومی وملکی مفادات کو نقصان پہنچانے کا باعث بنیں۔

میں تو ذاتی طورراس بات کا قائل ہوں کہ میرے لئے دو ہی پہچان اہم اور کافی ہیں۔ ہم پہلے مسلمان ہیں پھر پاکستانی ہیں۔ مسلمان نام ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے اور پاکستانی، پاکستان کی وجہ سے ملا ہے۔ البتہ مزید پہچان کے لئے قومیتوں کی بقا بھی ضروری ہے۔

یہاں پر اس بات کا ذکر شاید بے جانہ ہوگا کہ نام کی تبدیلی، خواہ افراد کی ہو یا آماکنہ کی، جائز بھی ہے اور بعض اوقات ضروری بھی ہوتا ہے۔ البتہ سنتِ نبویؐ کی رو سے یہ ضروری ہے کہ نام اچھے مفہوم ومعنی کا حامل ہو، جناب رسول اللہ ﷺ نے خود ہجرت کے بعد یثرب کا نام تبدیل فرمایا۔ یثرب کے معنی ہیں، بیماریوں اور گناہوں کی جگہ، جبکہ مدینہ طیبہ کے معنی، پاک شہر، کے ہیں، اسی طرح آپؐ نے ایک اس لڑکی کا نام بھی تبدیل فرمایا، جس کا نام والدین نے عاصیہ [گنہگار] رکھا تھا۔ آپؐ نے اپنے تینوں نواسوں کے نام حرب [جنگ] کی بجائے حسنؓ، حسینؓ اور محسنؓ رکھوائے تھے۔ لہٰذا افراد اور جگہوں کے عام یا بے معنی ناموں کو بامعنی اور اچھے ناموں سے تبدیل کرنا سنتِ نبویؐ کے ساتھ ساتھ لوگوں کو خوش کرنے کی وجہ سے بھی بن سکتا ہے۔ اس لئے اس حوالے سے اب یہ بحث سمیٹ کر ہم سب کو اپنے اپنے صوبوں اور وطن عزیز کی خدمت اور ترقی کے لئے خلوص کے ساتھ جت جانا چاہیئے۔ پاکستان ہے تو ہم ہیں، لہٰذا ہر دم، ہر فرد پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگائے رکھے۔

☆......☆......☆